علامہ انور شاہ کشمیریؒ کی عربی واُردو سوانح
ان کا علمی مقام، موضوعاتی اور فنی تجزیہ

مولانا ڈاکٹر محمد محامد ہلال اعظمی
ایڈیٹر ماہنامہ صدائے شبلی حیدرآباد چیرمین شبلی انٹرنیشنل ایجوکیشنل ٹرسٹ حیدرآباد

موضوع کی مناسبت سے سوانح کی تعریف، آغاز وارتقا اور اس کے اصول وضوابط کو یہاں مختصر بیان کردیا جائے تو علامہ کشمیریؒ کی سوانحی مواد کو سمجھنے میں آسانی ہوگی۔

سوانح، سانحہ کی جمع ہے، سانحہ عربی زبان کا لفظ ہے جس کے لغوی معنٰی ظاہر ہونے والا، پیش آنے والا، واقعہ اور ماجرا کے ہیں عام استعمال میں ناپسندیدہ اور وحشت انگیز واقعہ کو سانحہ کہا جاتا ہے، لیکن سوانح نگاری کی اصطلاحات میں اس کے لغوی معنٰی کا اعتبار کیا گیا ہے، مختلف ماہرین فن نے سوانح نگاری کی مختلف تعریفیں بیان کی ہیں، ان کا خلاصہ یہ ہے کہ سوانح عمری سے مراد زماں ومکاں، نسل اور ماحول کے پس منظر میں کسی مخصوص فرد کی داخلی اور خارجی زندگی کا ایسا جامع مطالعہ ہے جس سے اس کی زندگی کے ارتقا پر روشنی پڑے۔ (غیر افسانوی ادب ص ۱۴۳)

سوانح نگاری کا موضوع قدیم زمانے سے انسان ہے، اس دور میں جب انسان تحریر کے فن سے نا آشنا تھا تب بھی وہ اپنے خاندان، قبیلے کے سورماؤں اور سرداروں کے کارنامے، گیتوں، قصے، کہانیوں کی شکل میں محفوظ کرکے سینہ بہ سینہ نسل درنسل منتقل کرہا تھا، فن تحریر کی ایجاد کے بعد شروع شروع میں صرف بادشاہوں اور اقتدار پر فائز افراد کی سوانح عمریاں لکھی جاتی رہی ہیں، اہرام مصر کی اندرونی دیواروں پر جو عبارتیں کندہ ہیں انہیں تحریری سوانح نگاری کے اولین نقوش کہا جاسکتا ہے۔

عربی اور فارسی میں تذکرہ نویسی اور سیرت نگاری کی شکل میں سوانح عمری کی ابتدائی روایات قدیم دور سے ملتی ہیں اور انہیں دونوں زبانوں کی خوشہ نشیں اردو زبان ہے۔ عربی اور فارسی کے اثر سے اردو میں بھی بزرگان دین کے اقوال وملفوظات کو جمع ومحفوظ کرنے، علماء وشعراء، اولیاء اللہ کے تذکرے قلم بند کی روایت کا آغاز ہوا، باقاعدہ طور پر خواجہ الطاف حسین حالی اردو کے پہلے جدید سوانح نگار ہیں، انہوں نے اپنی سوانحی تصانیف ''حیات سعدی'' یادگار غالب اور حیات جاوید میں سوانح نگاری کو ایک خاص فن کے طور بنایا ہے۔ اور انھیں کے معاصرین علامہ شبلی نعمانی نے بھی معیاری سوانح عمریاں لکھی ہیں، شبلی کی سوانحی تصانیف میں المامون، سیرت النعمان، الفاروق، الغزالی، سوانح مولانا روم اور سیرت النبی ﷺ شامل ہیں، شبلی کی سوانح عمریاں روایت مع درایت ہیں اور ان میں تاریخی عنصر کا غلبہ نظر آتا ہے۔

ماہرین کا خیال ہے کہ ایک اچھی سوانح عمری، میں موضوع، مواد، اور اسلوب ہوتا ہے، سوانح نگار کو موضوع کا انتخاب کرنا پڑتا ہے اس کے حدود متعین کرنے پڑتے ہیں، کیونکہ زندگی واقعات کا خزانہ اور مسائل کا پشتار ہوتی ہے۔ ہر واقعہ اپنے اندر ایک کشش رکھتا ہے اس وجہ سے اسے ان واقعات کے گھنے جنگل سے ان واقعات کا انتخاب کرنا ہوتا ہے جو فرد کی ذات پر کردار کے ساتھ روشنی ڈال سکے۔ سوانح میں اس دور کی تاریخی، سیاسی، معاشی اور معاشرتی کشمکش کا اس حد تک اظہار کیا جائے کہ جس میں صاحب سوانح کا براہ راست تعلق ہو، فنی اعتبار سے ایک طرفہ سوانح بے جان سوانح ہے۔ عقیدت مندی یا صاحب سوانح کو تکلیف پہنچے گی، اس بنا پر حقائق سے آنکھیں بند کر لی جائیں، حقیقت پسندی اور حقیقت شناسی کو چھوڑ دیا جائے تو ایسی صورت میں سچائی مفقود ہو جاتی ہے جس کی وجہ سے سوانح کا وجود اور عدم برابر ہو جاتا ہے۔ سوانح نگار صرف یہی واضح کرے گا کہ وہ اعمال کیوں کیسے اور کس طرح کہے وہ یہ نہیں بتائے گا کہ وہ اعمال اچھے تھے یا برے اس کے پیش نظر یہ مقصد ہوتا ہے کہ سوانح عمری میں ایسی فضا پیدا کی جائے جس کے ذریعہ زندگی کا ارتقاء اور اس کے نشیب و فراز واضح طور پر سامنے آجائیں۔ سوانح نگار کے لئے سوانح میں دلچسپی پیدا کرنے کے لیے لطف بیان اور حسن اسلوب ضروری ہے، کیونکہ سوانح نگاری میں ادبی محاسن کا دار و مدار سوانح نگار کے اسلوب پر ہوتا ہے۔ اسلوب کو شگفتہ و شاداب اور دلکش ہونے کے ساتھ ساتھ حد ادب اور صاحب سوانح کے شایان شان ہونا چاہئے اگر اسلوب میں شوخی یا بے احتیاطی برتی جائے تو سوانح معیار سے گر جائے گی۔ مذکورہ بالا سوانحی اصول کی روشنی میں علامہ کشمیریؒ کی سوانحی ادب کا ذیل میں جائزہ پیش کیا جائے گا۔ علامہ کشمیریؒ پر عربی اور اردو میں بہت سے سوانحی مضامین اور کتابیں لکھی گئیں ہیں، ان سب کا احاطہ کرنا کارِ دشوار ہے، مگر مستقل گیارہ کتابیں اس وقت راقم کے پیش نظر ہیں:

(۱) نفحة العنبر	مولانا محمد یوسف بنوریؒ (عربی)
(۲) انوارِ انوری	مولانا محمد انوری لائلپوری (اردو)
(۳) سیرت انور شاہ کشمیری	پروفیسر عبدالصمد صارم (اردو)
(۴) حیاتِ انور	مولانا محمد ازہر شاہ قیصر (اردو)
(۵) مولانا انور شاہ کشمیری حیات اور کارنامے	قاری محمد رضوان اللہ (اردو)
(۶) الانور	مسٹر عبدالرحمٰن کوندو (اردو)
(۷) نقش دوام	مولانا انظر شاہ مسعودی (اردو)
(۸) جمال انور	مولانا عبدالقیوم حقانی (اردو)
(۹) انوار السوانح	ڈاکٹر غلام محمد کچھی (اردو)
(۱۰) علامہ انور کشمیری	مولانا عبدالرشید بستوی القاسمی (اردو)

اپنی ہشت پہلو شخصیت کے خدوخال

(۱۱) العلامة محمد انور الكشميری حياته وشعره عبدالملك مظفر خان الرسولفوری (عربی)

چونکہ علامہ کشمیری کی پیدائش وادیٔ لولاب کشمیر میں ہوئی، اس وجہ سے ان میں سے اکثر سوانح نگاروں نے اشارۃً یا تفصیلاً کشمیر کی تاریخی، سیاسی، سماجی، معاشرتی، قدرتی مناظر اور مصائب وحالات کا ذکر کیا ہے، اَلْاَنْوَر کے مصنف عبدالرحمان (کوندو) صاحب نے کشمیر پر قدرتی مناظر والی طویل طویل نظمیں جیسے علامہ اقبال کی نظم آرزو، مولانا حالی کی سیر کشمیر۔

مولانا شبلی کے قصیدہ کشمیریہ اور حفیظ جالندھری کی منظر کشمیر پر شامل کرنے کی کیا ضرورت تھی؟ نقش دَوَام کے مصنف مولانا انظر شاہ مسعودی نے اس باب میں تاریخی، سیاسی، معاشرتی، قدرتی مناظر کو حقائق کی روشنی میں بیان کیا ہے، کشمیر کی قدرتی خوب صورتی بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں لطفِ بیان ملاحظہ فرمائیں:

> ''حضرت شاہ صاحب مرحوم کا آبائی وطن وہی کشمیر ہے جو اپنے حسن وجمال رعنائی وکشش، جاذبیت ودلکشی، شبابی وشادابی میں عالمی شہرت رکھتا ہے، جس کی پرحسن فضا، دوڑتے ہوئے دریا، اچھلتا ہوا پانی، چشموں کی فراوانی، نکہتِ گل کی کثرت، پھلوں کی بہتات، آب وہوا کی خوشگواری، مناظر کا حسن، قدیم زمانہ سے سیاحوں کے دامن دل کو اپنی جانب کھینچتا رہا، بادشاہوں نے یہاں پر بارعیش کھولا اور خانقاہ بدوش صوفیا اس کے جمال دل افروز میں پاگرفتہ، پوری وادی صناعی میں قدرت کا ایک دلآویز نمونہ اور دستِ خالق کا تیار کردہ گلدستہ ہے''۔

اور اسی باب میں کشمیریوں کے پسماندگی کی وجوہات اور داخلی کمزوریوں کا ذکر کیا ہے۔

وہ لکھتے ہیں:

> ''جہالت کی وجہ سے یہ وادی بدعات ومحدثات کی گرفت میں ہے، مصنوعی پیروں کے غول اِدھر سے اُدھر دوڑ کر متاع دین کی قزاقی کررہے ہیں، دینی درسگاہوں کا نام ونشان نہیں اور جہاں تہاں کوئی مکتب ہے، اسے کشمیریوں کے شقاق نفاق نے کام کرنے کی مہلت نہیں دی، مسجدیں نمازوں سے زیادہ لایعنی نعروں میں گونج رہی ہیں، اکثر مساجد میں جناب رسول اکرم ﷺ کے مصنوعی موئے مبارک پر کشمیر کا سادہ لوح مسلمان پروانہ وار گر رہا ہے'' (ص:۱۹)

مولانا انظر شاہ نے کشمیر کی سیاسی صورت حال کا جائزہ لیا ہے، مہاراجہ رنجیت سنگھ، انگریزوں کی شاطری خرید وفروخت اور ڈوگرا راج مہاراجہ گلاب سنگھ آزادیٔ ہند اور تقسیم کشمیر کا ذکر کیا ہے، ان تمام باتوں کے درمیان علامہ کشمیریؒ کی ابتدائی اور جوانی کی زندگی گھومتی ہوئی نظر آتی ہے جب کہ

انوار السوانح کے مصنف ڈاکٹر غلام محمد کچھی نے ماضی کے آئینہ میں اس عنوان کے تحت برصغیر کی سیاسی، دینی، علمی، اقتصادی آزادیٔ ہند، دارالعلوم دیوبند کا ذکر کیا ہے۔ اگر علامہ کشمیری کی سوانحی مواد سے اس باب کو الگ کردیا جائے تو سوانح پر کسی بھی طرح کا

کوئی فرق نہیں پڑے گا، البتہ شاہ ولی اللہ تحریک کا اثر یا یوں کہئے کہ اس کی توسیع دارالعلوم دیوبند ہے اور دارالعلوم کے عظیم سپوت علامہ کشمیری ہیں، گویا کہ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ علامہ کشمیری شاہ ولی اللہ.....الغرض یوں کہا جاسکتا ہے کہ سوانح نگاروں نے علامہ کشمیریؒ تک رسائی کے لئے بہت سارے غیر ضروری اور طویل راستہ کا انتخاب کیا ہے جس کی وجہ سے یہ پس منظر پون حصے تک فن سوانح نگاری کے مطابق ہے۔

مذکورہ بالا کتابوں کے شروع میں تقریظات، پیش لفظ، مقدمہ اور دیگر عنوانات کے تحت مختلف اہل علم کے قلمی وعلمی تاثرات ہیں جن سے سوانح اور صاحبِ سوانح کی قدر ومنزلت کا احساس ہوتا ہے، ان کتابوں میں پہلی کتاب نفحة العنبر ہے، جو علامہ کشمیری کے ہونہار شاگرد مولانا یوسف بنوری کی تصنیف کردہ ہے، یہ کتاب بنیادی ماخذ کا درجہ رکھتی ہے، علامہ کشمیریؒ پر عربی اور اردو کی تمام سوانحی کتاب، مقالات ومضامین کا اگر ہم مطالعہ کرتے ہیں تو ہم سبھی کو اس کتاب سے مستفید ہوتے ہوئے دیکھتے ہیں۔ یہ کتاب علامہ کشمیریؒ کی وفات کے چار سال بعد شائع ہوئی، فصیح وبلیغ عربی زبان میں لکھی گئی ہے۔ اس کتاب کے تعلق سے مولانا شبیر احمد عثمانی رقم طراز ہیں:

> ''کتاب کے موضع اور اسلوب جمیل نے مجھ کو بالکلیہ اپنی طرف جذب کرلیا، پڑھتے وقت بلا مبالغہ یہ معلوم ہوتا تھا کہ گویا مرحوم کی تصویر آنکھوں کے سامنے کھڑی ہے اور خود گویا علامہ مرحوم اپنے خاص لب ولہجہ اور طرز ادا میں اپنے عقیدت کیشوں سے خطاب کررہے ہیں'' (نفحة العنبر ص:ب)

اس کتاب کی سوانحی شروعات سلسلہ نسب سے ہے چونکہ علامہ کشمیری کے سوانح نگاروں میں حسب ونسب کے سلسلے میں سید اور نعمانی کے درمیان اختلاف پایا جاتا ہے۔ اس وجہ سے بنیادی ماخذ سے اپنے نسب میں مولانا یوسف بنوری لکھتے ہیں:

> ابن الشيخ معظم شاه بن الشاه عبد الكبير بن الشاه عبد الخالق بن الشاه محمد الكبير بن الشاه محمد عارف بن الشاه حيدر بن الشاه علی بن الشيخ عبد الله بن الشيخ مسعود النروری الكشميری رحمهم الله تعالیٰ (ایضاً ص ا)

علامہ کشمیری کے اجداد بغداد سے ہندوستان آئے اور ملتان میں داخل ہوئے پھر لاہور پہنچے اس کے بعد مستقل کشمیر کو اپنا مسکن اور مدفن بنالیا۔ یہ سلسلہ نسب مذکورہ بالا کتابوں میں موجود ہے مگر جمال انور کے مصنف مولانا عبدالقیوم حقانی نے کچھ اضافہ کیا ہے وہ لکھتے ہیں: فخر المحدثین محدث کبیر حضرت مولانا محمد انور شاہ کشمیریؒ خاندانی سید تھے، آپ کا سلسلہ نسب چند واسطوں سے حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے ملتا (ص ۲۵) اسی طرح آپ کے فرزند مولانا انظر شاہ مسعودی اپنی کتاب نقش دوام میں دلچسپ پیرایہ کے ساتھ حسب ونسب کی بحث چھیڑا ہے اور اسی میں ثابت کیا ہے کہ ہمارا خاندان سادات سے متعلق وہ رقم طراز ہیں:

> ''مفسرین ومحققین علماء نے بعض آیات کے تحت واضح طور پر لکھا ہے کہ شرف نسب حاصل کرنے کے لئے اگر ننیہال سادات سے ہو تو اس کی جانب انتساب کرتے ہوئے خود کو سید کہنا ولکھنا جائز ہے''

حضرت شاہ صاحب مرحوم کی والدہ سیدہ تھیں۔آپ کی اہلیہ سیدہ تھیں،اس لئے خانوادۂ انوری کے بعض افراد اگر خود کو سید لکھتے ہیں یا حضرت شاہ صاحب نے اپنے نام کے ساتھ سید کے ضمیمہ کو حرف غلط قرار دیا تو یہ کوئی مجرمانہ اقدام نہیں تھا،جس کے لئے نصف صدی کے گزرنے پر بعض ناعاقبت اندیش قلم سزادہی کے لئے پرتول رہے ہیں (نقش دوام ص۲۲)

انوارالسوانح کے مصنف ڈاکٹر غلام محمد کھچی اورالانور کے مصنف عبدالرحمٰن کوندو نے دلائل سے ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ علامہ کشمیریؒ سید نہیں تھے بلکہ ان کا سلسلہ امام ابوحنیفہ سے ملتا ہے،ان دونوں نے مولانا یوسف بنوری کے شجرۂ نسب کو بنیاد بتایا اور کہا کہ علامہ کشمیری نے جو شجرہ بتایا ہے اس بنا پر یہ سلسلۂ نسب سلاطین فارسی سے ملتا ہے اور حوالہ دیتے ہوئے لکھتے ہیں کہ مولانا رضا بجنوری جو علامہ کشمیری کے داماد ہیں وہ آپ کے حسب نسب کے تعلق سے لکھتے ہیں:

''حضرت کا سلسلہ نسب حضرت امام اعظم ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے خاندان سے ملحق ہوجاتا ہے'' (انوارالسوانح ص۸۰)

اس کے بعد آپ نے مولانا بجنوری سے براہ راست ملاقات کر کے علامہ کشمیری کے حسب ونسب کے بارے میں دریافت کیا تو جواب تھا آپ سید نہیں ہیں مزید برآں اپنے دعویٰ کو مضبوط کرتے ہوئے انہوں نے لکھا ہے:

''حضرت شیخ نَورَی کو تذکرۃ الاولیاء کشمیر کے تمام مصنفین نے ان اولیاء کرام اور مشائخ میں سے شمار کیا ہے جو نسباً سید نہ تھے اور یہیں تک علامہ کشمیریؒ نے اپنا شجرۂ نسب ذکر کیا ہے''۔

اس سلسلے میں اَلانوار عبدالرحمٰن کوندو نے علامہ کشمیری کو نعمانی ثابت کرنے کے لیے ایک ۹ صفحات پر مشتمل حضرت شاہ صاحب اور مسئلہ سعادت کے عنوان سے سے دلائل کے انبار کے ساتھ مضمون لکھا اور حدّ ادب میں رہتے ہوئے غیر جانبداری کا ثبوت دینے کی کوشش کی ہے وہ لکھتے ہیں:

''ایک بار کسی اخبار نویس نے حضرت شاہ صاحبؒ کے اسم گرامی کے ساتھ لفظ سید لکھا تھا تو حضرتؒ نے اس کی تردید میں مقامی اخباروں میں ایک بیان بھیجا جس کے الفاظ یہ تھے''میں رسول اللہ ﷺ کی آل واولاد کا غلام ہوں اور محبّ عترت ہوں،مگر سید نہیں ہوں۔(الانوار ص۱۷۷)

سید اور نعمانی کی بحث سوانح نگاروں کے مابین الفاظ کے پیکر کے ساتھ دلچسپ دکھائی دیتی ہے جس میں لطف بیان کا احساس ہوتا ہے مگر ایسا محسوس ہوتا کہ مواد کے گھنے جنگل میں سوانح الجھتی ہوئی چلی جاتی ہے اکر کمالاتی بنا پر سید علامہ کشمیریؒ کو مان لیا جائے جیسا کہ آپ کو اسی کا حق حاصل ہے تو بحث اس طرح کی طوالت کا شکار نہیں ہوتی اور سوانح نگاروں کو اپنے موضوع سے انصاف کرنے کا مزید موقع ملتا،اس سلسلہ میں اعتدال کی راہ اختیار کرتے ہوئے علامہ انور شاہ کشمیری اپنی ہشت پہلو شخصیت کے مصنف مولانا عبدالرشید بستوی قاسمی نے سید اور نعمانی کی بحث میں جائے بغیر یہ فرمایا:

''شاہ صاحب کا شجرۂ نسب بہت حد تک محفوظ اور دستاویزی شکل میں موجود ہے،لیکن

الکشمیریؒ نے جہاں بھی اپنا سلسلۂ نسب ذکر کیا ہے، صرف دسویں پشت شیخ مسعود حنفی تک ہی نقل کیا، اس طرح یہ بتانا چاہا کہ شیخ مسعود تک نسب بالکل حتمی اور یقینی اور کسی بھی آمیزش سے پاک ہے'' جو درج بالا میں ہے (ص ۲۲)

اور فارسی کا جملہ علامہ کشمیری کے اسلاف پر صادق آتا ہے کہ ایں خانہ ہم آفتاب است یہی موروثی اثر علامہ کشمیری پر زندگی کے مراحل میں نظر آتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔

پیدائش کے تعلق سے اکثر سوانح نگاروں نے مولانا یوسف بنوریؒ کی کتاب نفحة العنبر سے استفادہ کرتے ہوئے لکھا ہے یعنی علامہ کشمیریؒ کی پیدائش ۲۷ر شوال ۱۲۹۲ھ - ۱۶ یا ۱۷ر اکتوبر ۱۸۷۵ء کو بروز شنبہ بہ وقت سحر، ان کے ننھیال موضع ''دودوان'' وادیٔ لولاب کشمیر میں ہوئی (ایضاً ص ۲۶) الانور کے مصنف نے ۱۷ر اکتوبر کی حتمی تاریخ لکھی ہے (ص ۲۰) انوار السوانح میں دودھواں، اور صرف ۱۶ر اکتوبر لکھا ہے، جمال انور کے مصنف نے ولادت کی تاریخ وسن ہجری میں لکھا ہے اور موضع دودھوان دراصل دُودَوَن ہے اور کشمیری زبان میں اس کا مطلب ہے دودھ سے بھرپور جنگل اس کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ اس گاؤں کے شمال مشرق کی طرف نہایت سرسبز چراگاہ تھی جس میں گائیں، بھینس اور بکریاں وغیرہ چر کر خوب دودھ دیتی تھیں، اس لئے مقامی لوگوں نے اس چراگاہ کو دُودَوَن کا نام دیا اور بعد ازاں پورا گاؤں دودھوان کے نام سے مشہور ہوا (ص ۲۷)

آپ کے والد محترم کا نام مولانا محمد معظم شاہ تھا جو حنفی عالم دین فقیہ، فارسی زبان کے قادر الکلام شاعر، سہروردیہ سلسلہ میں مجاز طریقت تھے، مولانا بنوریؒ ان کے تعلق سے لکھتے ہیں:

"الراشد المسترشد، العابد الزاهد ملجأ القوم فی النوائب ملاذهم فی المهمات الدينية والدنيوية (نفحة العنبر ص ۲)

الانوار کے مصنف کوندو صاحب اس ضمن میں لکھتے ہیں:

''حضرت شاہ صاحبؒ کے والد بزرگوار مولانا معظم شاہ صاحب کی علمی وسعت، صرف صرف تفسیر وحدیث، فقہ اور دینی علوم تک محدود نہ تھی، بلکہ علم تاریخ اور علم انساب وغیرہ میں بھی آپ کی مہارت مسلم تھی'' (ص ۱۶ ۷)

انور السوانح کے مصنف ڈاکٹر غلام محمد کچھی نے آپ کے والد بزرگوار کی علمی عظمت کا اعتراف کرنے کے بعد رقم طراز ہیں:

''مولانا محمد معظم شاہؒ، مولانا انور شاہ کشمیریؒ کی وفات کے بعد سال یا دو سال تک بقید حیات رہے، اور ۱۲۵ سال کی عمر میں ورنو ''وادیٔ لولاب'' ضلع بارہ مولا میں ۱۳۵۶ھ کو وفات پائی۔ (ص ۸ ۷)

نقش دوام کے مصنف اپنے جدّ امجد کے متعلق رقم طراز ہیں:

''صاحب سوانح کے والد مولانا معظم شاہ صاحب ضلع مظفر آباد تحصیل کرناؤ میں پیدا ہوئے،

یہ وادیٔ کشمیر کے ایک جید عالم اور خانقاہ نشیں بزرگ تھے، ہزاروں کشمیریوں نے ان کے دست حق پرست پر بیعت کی، سہروردیہ سلسلہ میں مجاز طریقت تھے، ایک سو پندرہ سال کی طویل عمر میں وفات پائی اور اپنے نامور وفاضل روزگار بیٹے کے سانحۂ وفات کا دلدوز منظر بھی اپنی آنکھوں سے دیکھا'' (ص ۲۶)

علامہ کشمیریؒ کی والدہ محترمہ کا نام ''بی بی مال دیدی'' تھا۔ وہ بڑی زاہدہ اور عبادگزار تھیں، مولانا محمد یوسف بنوریؒ کے بہ قول "كانت يتيمة دهرها فى الورع والزهد والعبادة. (نفحۃ العنبر ص ۱) ورع اتقاء۔ زہد وتقشّف اور عبادت وریاضت میں اپنے زمانے میں طاق تھیں۔

کشمیری زبان میں مال کے معنی پہاڑ کی اونچی چوٹی ہے، اور دیدی کا لفظ کشمیری زبان میں عزت واحترام کا مفہوم ادا کرنے کے لئے بڑا جامع لفظ ہے۔ جس کے معنٰی ماں بھی ہیں اور بڑی بہن بھی۔ یوں بھی اگر کسی خاتون کا عزت یا عمر کے لحاظ سے ادب کرنا ہوتو اس کو بھی دیدی کہہ کر خطاب کیا جاتا ہے بنابرآں ''مال دیدی'' کا مفہوم ہے ''پہاڑ کی اونچی چوٹی کی طرح بلند رتبہ خاتون، یعنی سر بلند اور پروقار ہستی'' (الانوار ص ۲۰، ۲۱)

شاہ صاحب کے سوانح نگاروں نے ان کے والدین کے ظاہری وباطنی کمالات کو اجاگر کیا ہے جیسا کہ بالا حوالوں کی روشنی میں دیکھا جاسکتا ہے اور اسی سے یہ بات نکلتی ہے کہ ان پاکیزہ نفوس کے زیر سایہ جس شخص کی پرورش وتربیت ہوگی اس کا کیا پوچھنا؟

علامہ کشمیریؒ کی ابتدائی تعلیم پر نقش دوام کے مصنف کی تحریر ملاحظہ فرمائیں:

''عمر کا پانچواں سال شروع ہوا تو والد ماجد سے قرآن کریم پڑھنا شروع کیا، اور مختصر مدت میں ناظرہ مکمل کرلیا، سات سال کی عمر میں فارسی کی بعض کتابیں پڑھ چکے تھے۔ والد مرحوم نے بعد میں گلستاں، بوستاں، جامی نظامی، خسرو دہلوی اور جلال الدین دوّانی کی نظر ونثر میں معیاری کتابیں پڑھا دیں، جس سے فارسی میں وہ قوت ودستگاہ حاصل ہوگئی جس کا اظہار آپ کی بے تکلف فارسی نثر ونظم سے ہوتا ہے، فارسی سے فراغت کے بعد مولانا غلام محمد رسونی پورہ سے عربی شروع کی اور دو ہی سال میں صرف ونحو، فقہ واصول فقہ وغیرہ کی تکمیل کی، بچپن میں ذکاوت وذہانت اور ایک تابناک مستقبل کے آثار چہرہ وبشرہ سے عیاں تھے، آپ کے والد صاحب کا بیان ہے کہ انور شاہ جب مختصر القدوری مجھ سے پڑھ رہے تھے تو کبھی ایسے سوالات کرتے جن کا جواب اہم فقہی کتابوں سے مراجعت کے بغیر ممکن نہیں تھا'' (ص ۲۸)

کشمیر میں ابتدائی علوم وکمالات کی تکمیل کے بعد حصول علم کے لئے شفیق والدین کی مرضی کے خلاف لیکن تابناک مستقبل کے لئے ہزارے کے لئے چل پڑے۔ اس دور میں ہزارہ علم کا مرکز اور ریختہ کار علماء کا مستقر بنا ہوا تھا، اور آپ کے چار قریبی رشتہ ہزارہ

میں تعلیم حاصل کررہے تھے، تین سال یہاں قیام فرما کر علوم عالیہ وآلیہ کی بنیادی علوم کی تحصیل کی۔ علامہ کشمیری کی علمی لیاقت کو محسوس کرتے ہوئے ایک مشہور عارف نظام الدین نقشبندی مجددی نے کہا:

''ان شاء اللہ! یہ اپنے وقت کے ان علماء میں سے ہوں گے جن سے دنیائے اسلام کو فیض پہنچے گا اور سنت نبوی ﷺ کو فروغ ملے گا۔ اور ایک عالم نے علامہ کشمیریؒ کے ہاتھ سے لکھے ہوئے حواشی منطق اور نحو کے رسائل پر دیکھے تو بولے: یہ بچہ تو اپنے وقت کا رازی اور اپنے زمانہ کا غزالی ہوگا۔ (انوار سوانح ص ۸۵)

علامہ کشمیریؒ کے اس دوران کے چند اساتذہ کے نام ملتے ہیں جیسے آپ کے والد پیر محمد معظم شاہ، مولوی عبدالجبارؒ مولانا غلام محمد رسونی پورہ، محترم محمد جو جندلؒ (ایضاص ۸۶) اور قیام ہزارہ کے دوران شاہ صاحب نے غالباً متعدد دانش گاہوں میں حاضر ہوکر مختلف علوم وفنون کے ماہر اساتذہ سے استفادہ کیا ہوگا، البتہ اتنا ضرور معلوم ہوتا ہے کہ حضرت شاہ صاحب نے قیام ہزارہ کے دوران جن اساتذہ ومشائخ سے استفادہ کیا ان میں فقہ اور اصول فقہ کے مایہ ناز استاذ حضرت مولانا فضل الدین صاحب قصبہ کا کول شامل ہیں۔ ص ۳۲، ۳۳ (علامہ انور شاہ کشمیری) مصنفہ مولانا عبدالرشید بستوی قاسمی۔ علامہ کشمیریؒ کے دیگر سوانح نگاروں نے مذکورہ نام کے اساتذہ کی فہرست میں شامل نہیں کیا ہے۔ لیکن آپ ۱۳۰۸ھ میں وطن مالوف آگئے، اسی اثنا میں آپ ہزارہ میں دارالعلوم دیوبند کا نام اپنے اساتذہ سے سن چکے تھے، دل میں مزید علمی تشنگی آپ کے علاقے میں حکومت وقت کی طرف سے زمینوں کی پیائش ہورہی تھی اس سلسلے میں عبدالرحمٰن کوندو لکھتے ہیں:

''اس زمانہ میں کشمیر میں زمینوں کا پہلا قانون بندوبست ہورہا تھا اور یہ وہ سال تھا جب علاقہ لولاب میں بھی زمینوں کی پیائش ہورہی تھی، پیائش زمین علم ہندسہ وحساب اور مساحت ارض کے بہت سے علمی اصولوں پر مبنی ہے، چونکہ ہر نئے علم کے حصول کی تڑپ حضرت شاہ صاحب کے متلاشی حقائقِ دل میں ازل سے ودیعت ہوچکی تھی۔ اس لئے بندوبستی کام کو ذرا قریب سے ملاحظہ کرنے کے بعد حضرت شاہ صاحبؒ کو علم مساحت، علم ہندسہ وحساب اور پیائش سے کچھ ایسی دلچسپی پیدا ہوئی کہ آپ نے سال بھر کے لئے سب کام کو ملتوی کرکے اپنی تمام دلچسپیاں اسی پر مرکوز کردیں'' (الانوار ص ۸۷)

دیوبند سے شاہ صاحب کے پاس آپ کے رشتہ دار بھائی مولوی عبدالمجید شاہ کے خطوط آرہے تھے، ان خطوط کی وجہ سے آپ کا علمی اشتیاق اور بڑھ گیا اور والد محترم کی بھی آرزو اور ہمت افزائی ہورہی تھی اور مشیت ایزدی تقدیر معلق کو آگے بڑھا رہی تھی، مسببات ظاہری وباطنی نے شاہ صاحب کو کشاں کشاں دیوبند پہنچادیا۔ اس ضمن میں نقش دوام کے مصنف رقم طراز ہیں:

''کشمیر میں بعض اساتذہ سے دیوبند کا ذکر سنا اور یہ بھی کہ علوم اسلامیہ کی واحد یونیورسٹی دیوبند میں ہے، جہاں کے اکابر اساتذہ کی شہرت عالم اسلام کو اپنی طرف متوجہ کئے ہوئے

تھی، دیوبند کا یہ وہ دور تھا جس کی سیادت حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ فرمارہے تھے، چنانچہ ۸/ یا ۱۳۰۷ھ میں دیوبند تشریف فرما ہوئے تو مدرسہ کے جائے وقوع اور ذمّہ داران مدرسہ سے ناواقفیت کی بنا پر دارالعلوم سے قریب شہر کی مشہور مسجد قاضی میں فروکش ہوئے، متولی قاضی احمد حسین نے دیکھا تو دریافت کیا کہ میاں تم کس ارادے سے دیوبند آئے ہو؟ ارشاد ہوا کہ حضرت مولانا محمود حسنؒ سے حدیث پڑھنے کے لئے کشمیر سے آیا ہو، متولی صاحب نے پہلے کھانا کھلایا پھر اس نو وارد کو لے کر شیخ الہند مرحوم کی خدمت میں پہنچے (نقش دوام ص ۲۹، ۳۰)

اور اسی طرح کی بات ڈاکٹر رضوان اللہ صاحب نے بھی لکھا ہے۔ اور اس ضمن میں انوار السوانح کے مصنف ڈاکٹر غلام محمد لکھتے ہیں:

''ان کی اس بات میں کوئی وزن نہیں کیونکہ مولانا انور شاہ صاحب کے داخلہ سے پہلے آپ کے چچازاد بھائی مولوی عبدالمجید شاہؒ ہزارہ سے فراغت حاصل کرنے کے بعد ۱۳۰۸ھ) میں دارالعلوم میں داخلہ لے چکے تھے، اور انہوں نے خط لکھ کر آپ کو بھی دارالعلوم آنے کی ترغیب دی، ۱۳۱۰ھ میں جب آپ دیوبند میں پہنچے تو آپ کے بھائی نے ہی داخلہ کے سلسلہ میں آپ سے تعاون کیا، جب رجسٹر میں میں نام کا اندراج ہورہا تھا تو انہوں نے مولانا انور شاہؒ کے نام کے ساتھ مظفرآبادی بھی لکھوادیا تھا (ص ۸۷) البتہ مسجد قاضی میں قیام کے تعلق سے ہاسٹل میں متفق ہیں کیونکہ جس زمانے مں شاہ صاحب کا داخلہ ہوان دنوں مطبخ میں طلبہ کے کھانے پکانے کا انتظام محدود تھا، گنجائش کی کمی کی وجہ سے بعض طلبہ کو دیوبند کی مساجد کے حجروں میں ٹھہرایا جاتا تھا، طلبہ اس میں امامت اور صاف صفائی کرلیا کرتے تھے، مسجد قاضی کے حجرے میں آپ کی معیت مولانا مشیت اللہ بجنوری کے ساتھ رہی، مولانا مشیت اللہ بجنور کے ایک زمین دار کے لڑکے تھے، اور یہیں سے دونوں عمر بھر کے رفیق بن گئے، مولانا مشیت اللہ بجنوری کا بیان ہے کہ رات کا بیشتر حصہ آپ کا عبارت ومطالبہ میں گزرتا تھا''۔

شاہ صاحب بحیثیت متعلم ۱۳۱۱ھ میں دارالعلوم میں داخل ہوئے اور ۱۳۱۴ھ میں دورۂ حدیث مکمل کرکے دارالعلوم سے فارغ ہوئے، اسی دوران آپ نے علوم عالیہ یعنی تفسیر قرآن: جلالین، تفسیر بیضاوی، حدیث: بخاری شریف، ابوداؤد شریف، مسلم شریف، جامع ترمذی، مؤطا امام مالک، نسائی وابن ماجہ۔ فقہ: ہدایہ آخرین وغیرہ اور علوم آلیہ منطق میں قاضی مبارک، ہیئت اور فلسفہ میں تصریح شرح چغمنی اور صدورا، شمس بازغہ اور طب میں نفیسی پڑھیں اور ان کتابوں کا امتحان دیا جس میں آپ کو اوّل درجے کی

کامیابی حاصل ہوئی۔شاہ صاحب کے دارالعلوم کے اساتذہ میں سے یہ نام قابل ذکر ہیں:

مولانا محمود حسن شیخ الہندؒ، مولانا خلیل احمد سہارنپوری، مولانا محمد اسحاق کشمیری ثم مدنی، مولانا غلام رسول ہزارویؒ، مولانا حکیم محمد حسنؒ، مولانا عبدالعلیؒ۔

دورۂ حدیث سے فراغت کی ایک سند صدر المدرسین مولانا محمود حسنؒ نے بھی دی جس میں انہوں اپنے تأثرات ان الفاظ میں تحریر کئے ہیں:

> ''خداوند تعالیٰ نے مولانا انور شاہؒ میں علم، عمل مع سیرت، صورت، ورع، زہد، رائے صائب اور ذہن ثاقب کو جمع کر دیا ہے، اور جب شاہ صاحب فراغت کے بعد گنگوہ گئے تو حضرت گنگوہی نے آپ کو سند حدیث دی اور تصوف کے سلسلۂ چشتیہ میں بیعت کر کے رخصت کر دیا''۔(انوار السوانح ص ۸۹)

دارالعلوم دیوبند سے ۱۳۱۴ھ میں فارغ ہوکر چند مہینوں تک دہلی میں مدرسہ عبدالرب میں تدریسی خدمات انجام دی، لیکن نقش دوام کے مصنف نے اس تدریسی خدمات پر شک کا اظہار کیا ہے، وہ لکھتے ہیں:

> ''مدرسہ عبدالرب کی تدریسی سے متعلق کوئی مستند روایت راقم الحروف تک نہیں پہونچی''(ص ۲۴)

اسی اثنا میں اولین رفیق مولانا مشیت اللہ بجنوری کے اصرار پر کچھ عرصہ کے لیے بجنور میں رہے، ابھی آپ بجنور ہی میں تھے کہ آپ کے ایک اور ہم درس مولانا امین الدین آپ کے پاس آئے اور اپنا ارادہ ظاہر کیا کہ دارالعلوم دیوبند کے طرز پر دینی وعربی علوم کی درس گاہ دہلی میں قائم کرنا چاہتا ہوں اور آپ کو اپنا شریک کار بنانا چاہتا ہوں، آپ تیار ہوگئے، مولانا امین الدین کے نام پر المدرسۃ الامینیہ کا ربیع الثانی ۱۳۱۵ھ میں افتتاح ہوا اور آپ کو اسی مدرسہ کا صدر مدرس بنایا گیا۔

مولانا انور شاہ صاحبؒ اس مدرسہ کے بارے میں کہتے ہیں:

> ''جب مولانا امین الدین مجھے لینے کے لیے بجنور پہنچے تو یہ خیال کر کے کہ مدرسہ چلے نہ چلے مگر مولوی صاحب کی دل شکنی نہ ہو اس لئے ان کے ساتھ ہولیا، دہلی پہنچ کر سولہ، سترہ روپیہ جو میرے پاس تھے وہ بھی میں نے مولانا کے حوالے کر دیئے۔یہی روپیے مدرسہ کا سب سے پہلا سرمایہ تھا، مولانا امین الدینؒ نے اس رقم سے کاغذ خرید کر مدرسہ کے لیے رجسٹر بنائے اور طلبہ کا داخلہ شروع ہوگیا، طلباء کا اچھا خاصا اجتماع ہوگیا۔مسلمانوں نے بھی توجہ کی اور مدرسہ کی مالی حالت قابل اطمینان ہوگئی''۔(انوار السوانح ص ۹۰، ۹۱)

آپ مدرسہ امینیہ میں ربیع الثانی ۱۳۱۵ھ سے ۱۳۲۰ھ تک درس وتدریس میں مشغول رہے کہ اسی اثنا میں یہ حادثہ پیش آیا ۱۳۲۰ھ/۱۹۰۲ء میں بقول مولانا انظر شاہ اپنی والدہ کی وفات پر اور بقول عبدالرحمٰن کوندو اپنے بڑے بھائی مولوی یاسین کے انتقال پر

دہلی سے لولاب کشمیر لوٹنا پڑا۔ پھر آپ کے اولیاء نے کشمیر سے باہر جانے کی اجازت نہ دی، وطن مالوف میں قیام کے دوران اہل وطن کی خستہ حالت کو دیکھا ارادہ کرلیا مدرسہ قائم کر کے عوام میں تعلیمی بیداری پیدا کی جائے ابتداءً وعظ وتلقین کا سلسلہ شروع کیا، اسی اثنا میں حرمین شریفین کا اشتیاق پیدا ہوا، قصبہ بارہ مولہ کے نو (۹) افراد آپ کے ساتھ حج کے لیے تیار ہوگئے، رئیس آف بارہ مولہ نے اس قافلہ کے تمام اخراجات خود ادا کئے۔ (انوار السوانح ص ۹۲)

اس ضمن میں مولانا عبدالرحمٰن کوندو لکھتے ہیں:

''حضرت شاہ صاحبؒ نے اگر چہ اپنے لئے سفر حج کا انتظام اپنے طور پر کر رکھا تھا لیکن رئیس خواجہ عبدالصمد ککرو نے اصرار کیا کہ وہ اسی قافلہ کے نو ارکان کے اخراجات خود برداشت کریں گے اور شاہ صاحب نے اس کو مان لیا تا کہ ان کے دوست کے جذبۂ فیاضی کو ٹھیس نہ لگے'' (الانوار ص ۱۱۹)

سوانح نگاروں نے آپ کے سفر حج کے محرکات حج، ہجرت اور علمی تشنگی لکھا ہے، فریضۂ حج ادا کرنے کے بعد یا اس کے دوران کئی مقامات سے آئے ہوئے طرابلسی، بصر، مصر، شام وغیرہ سے جلیل القدر علماء سے آپ کی ملاقات ہوئی، سب نے آپ کی خداداد علمی استعداد دیکھ کر تبرکاً واعزازاً سندات حدیث عطا فرمائیں۔ اور جب آپ روضۂ اطہر پر عرض سلام کے لئے حاضر ہوئے تو نطق انور سے ایسی نعت جاری ہوئی جس کا ایک مصرع فارسی اور دوسرا عربی ہے، ان دونوں زبانوں پر آپ کو یکساں قدرت تھی دو شعر ملاحظہ فرمائیں:

اے صباحا لم رساں نزدِ رسولؐ ☆ اذ مــآلــی نــحــو مــولیٰ قــریــاؤل

گرچہ از تر دامنی ختم ولے ☆ عــلــیّ ان اروىٰ اذا ھبّــت قبــول

(الانوار ص ۱۲۱)

شاہ صاحبؒ نے مکہ معظّمہ، مدینہ منورہ کے روحانی فیوض وبرکات کے ساتھ وہاں کے علمی کتب خانوں سے نوادرات علمی کا مطالعہ کیا، اور آپ نے کشمیر کے تلخ تجربات اور وہاں کی عظمت سے یہ بھی عزم کرلیا کہ جیسے حاجی امداد اللہ صاحب اور دیگر اکابر نے ہند سے حجاز ہجرت کرلی ہے اور مستقل ان لوگوں نے یہاں مستقر بنالیا تھا میں بھی مقیم ہوجاؤں، حج کے رفقاء کو خبر لگی تو ان لوگوں نے بالخصوص خواجہ عبدالصمد کلرو کو سخت جھٹکا لگا، کیونکہ انھیں شاہ صاحب کشمیر کے لئے ایک ایسی شمع کے مانند تھے کہ جس کی وجہ سے کشمیر کی تاریکی دور ہوجائے گی۔ بارہا طویل گفتگو سے شاہ صاحب کو خواجہ صاحب نے ایک دارالعلوم کے قیام میں مکمل تعاون کا وعدہ کر کے راضی کرلیا، اس طرح شاہ صاحب سفر حج سے واپس ہوئے۔ ۱۳۳۴ھ-۱۹۰۷ء میں بارہ مولہ میں مدرسہ فیض عام کے نام سے ایک دینی ادارہ قائم کیا، عزائم ومقاصد میں تنوع تھا، عوام کی عدم دلچسپی، مدرسہ کے معاونین کی سرد مہری کی وجہ سے شاہ صاحب دل برداشتہ ہوگئے۔ مولانا امین الدین کے نام ایک مکتوب مورخہ ۲۷/ جمادی الاول ۱۳۲۸ھ میں لکھا ہے کہ:

''یہاں سے دل برداشتگی کا سبب یہ ہے کہ یہاں آکر مخلوق کی بدمعاملگی کا زیادہ احساس

ہوتا رہا'' (معارف نمبر۳ جلد۱۰۰ص ۱۸۷)

حسرت ان غُنچوں پہ ہے جو بن کھلے مرجھا گئے، چنانچہ ۱۳۲۸ھ ہی میں مدرسہ فیض عام تقریباً چار سال کی عمر پا کر ختم ہو گیا۔

مدرسہ فیض عام کے بند ہونے والے اسباب پر سوانح نگاروں نے یہ رائے قائم کی ہے کہ شاہ صاحب کے صبر جمیل کی وجہ سے اس پر وہ پڑا ہوا ہے جب کہ بالا کے حوالے سے اسباب کا پتہ چلتا ہے اسی وجہ سے کہنے میں کوئی مضائقہ نہیں کہ حضرت شاہ صاحبؒ انبیاء کے وارث اور ملکوتیت کی جنس سے نہیں ہیں۔

مدرسہ فیض عام کے بند ہو جانے کے بعد شاہ صاحب کے دل میں ہجرت حجاز کا ارادہ پکا ہو گیا، افراد خاندان سے اجازت بھی لے لی، بغرض ملاقات اپنے اساتذہ دیوبند پہنچے، اسی اثناء میں دارالعلوم دیوبند کی طرف سے فارغین کے لئے جلسہ دستار بندی ہونا طے تھا، اس اجلاس میں شاہ صاحبؒ کی سب سے پہلے دستار بندی کی گئی، جلسۂ دستار بندی کی تقریب سے کامل فراغت کے بعد پھر حضرت شیخ الہند اور حضرت مولانا حافظ محمد احمد سے ملاقات کی اور عرض کیا ارادہ ہے ہجرت حجاز مقدس کا ان دونوں بزرگوار نے اجازت دیا بلکہ بہ اصرار یہ فرمایا کہ آپ کو دارالعلوم میں کام کرنا ہے، کچھ سوانح نگاروں نے مولانا حسین احمد مدنیؒ کے حوالہ سے یہ بھی لکھا کہ جلسہ دستار بندی سے قبل مولانا حافظ محمد احمد مہتمم دارالعلوم نے حضرت شیخ الہندؒ اور دیگر اساتذہ کے سامنے یہ عرض کیا تھا کہ انور شاہ، عبید اللہ سندھی وغیرہ کو دارالعلوم میں بلا لیا جائے تا کہ ان کی صلاحیتوں سے استفادہ کیا جائے۔

ہجرت حرمین شریفین کا ارادہ لے کر شاہ صاحب نے اپنے استاذ کے حکم کو قبول کر لیا، اس طرح آپ دارالعلوم دیوبند کے مدرس بنے اور آپ نے صحیح مسلم، سنن نسائی اور سنن ماجہ جیسی کتابوں کا درس دینا شروع کر دیا، اصرار کے باوجود مشاہرہ لینے پر راضی نہ ہوئے، مگر مہتمم مولانا حافظ محمد احمد صاحب اس بات پر کہ کھانا میرے ساتھ کھائیں اس پر راضی کر لیا، مہتمم صاحب کا دستر خوان بظاہر کھانے کا دستر خوان ہوتا تھا لیکن کئی اہل علم کی موجودگی میں جیسے مولانا عبید اللہ سندھی، مولانا حبیب الرحمن صاحب، مولانا شبیر احمد عثمانی اور متعدد اساتذہ دارالعلوم کے شریک ہونے کی وجہ سے علمی بن جاتا تھا، عبدالرحمٰن کوندو لکھتے ہیں:

> ''یہ دستر خوان، مائدہ علم و فضل بن جانا اور اس دستر خوان پر صرف بدنی غذا ہی جمع نہ ہوتی تھی بلکہ روحانی غذاؤں کے قسم قسم کے الوان جمع ہو جاتے تھے'' (الانور ص ۱۵۵)

۱۳۲۹ھ-۱۹۱۲ء ۵/اپریل کو عالم اسلام کے مشہور عالم علامہ رشید رضا مصری دارالعلوم دیوبند تشریف لائے، ان کے اعزاز میں خیر مقدمی جلسہ نوردہ میں منعقدہ ہوا، حضرت شاہ صاحبؒ ہی نے تعارفی تقریر فرمائی پوری تقریر نقش دوام مصنفہ مولانا انظر شاہ مسعودی کے آخر میں موجود ہے) جس میں ہندوستان میں علم حدیث کی تاریخ شاہ ولی اللہ دہلوی کے خانوادے کی خدمات جلیلہ، انداز درس، علماء دیوبند کے طریقۂ تدریس حدیث، مسلک دیوبند اور کتاب وسنت سے استخراج مسائل کے لیے فقہ کے مشہور تین اصول، تخریج مناط، تحقیق مناط، تنقیح مناط سمیت بہت سے امور پر سیر حاصل گفتگو کی، اس تقریر پر علامہ رشید رضا مصری نے جو تاثر بیان کیا ہے وہ یہ تھا۔

> ''ہندوستان میں آ کر اس مدرسے کی نسبت جو کچھ میں نے سنا تھا، اس سے بہت زیادہ پایا،

استاذ مولانا انور شاہ صاحب نے جو اصول میرے سامنے بیان کیے ہیں، جو مسلک اپنے
مشائخ کا مجھے بتایا ہے میں اس کو پسند کرتا ہوں اور اس سے متفق ہوں (علامہ انور شاہ کشمیر)
مصنفہ مولانا عبدالرشید بستوی بحوالہ سالانہ روداد دارالعلوم دیوبند ۱۳۳۰ھ ص ۴۰۔

حضرت شاہ صاحبؒ مجرد زندگی کو ترجیح دے رہے تھے اس کا سبب فنافی العلم اور ہجرت حجاز کا ارادہ ذہن ودماغ میں چل رہا تھا، اس لئے اکابرین دیوبند کو یہ کھٹکا لگا رہتا تھا کہ کہیں یہ شہباز دیوبند حرمین شریفین کے لئے اڑ نہ جائے، بقول عبدالرحمٰن کوندو کے حضرت شاہ صاحب کو دارالعلوم میں روکنے کے لئے مولانا حبیب الرحمٰن صاحبؒ نے نکاح کی تجویز رکھی، دارالعلوم دیوبند کے ارباب حل وعقد اور حضرت شیخ الہندؒ نے سنت رسول ﷺ کی ترغیب دی، اس طرح آپ راضی ہوئے، اکابرین دیوبند نے آپ کی شادی گنگوہ کے ایک معزز خاندان میں ۱۳۳۶ھ میں کرادی۔ اخراجات کا سلسلہ بڑھا تو انتظامیہ نے معاوضہ قبول کرنے پر بہت زور دیا، آپ نے بقدر کفاف مشاہرہ قبول فرمایا۔

جب ۱۳۴۲ھ-۱۹۱۵ء حضرت شیخ الہندؒ انگریزی حکومت سے نجات کے لیے ایک وسیع محاذ منظم کرنے کے لئے سفر حجاز اختیار فرمایا تو جانے سے قبل آپ نے اپنی نیابت حضرت شاہ صاحبؒ کو عطا کی، بقول مولانا سید محمد میاں صاحب دیوبندیؒ کے دارالعلوم کی جانشینی ایک ایسی قبا تھا، جو بلا کسی قطع وبرید کے حضرت شاہ صاحبؒ کے قامت موزون پر راست آرہا تھا۔ (الانوار ص ۱۶۷)

چنانچہ حضرت شیخ الہندؒ کے تشریف لے جانے کے بعد حضرت شاہ صاحب نے قائم مقام صدر مدرس کی حیثیت سے درس بخاری وترمذی کو سنبھال لیا، بقول قاری طیبؒ کے ''علمی پیاسوں کو یہ محسوس نہ ہوا کہ وہ علم کے ایک بحر ذخار سے محروم ہوگئے ہیں، بلکہ انہیں یہ محسوس ہوا کہ اگر سمندر سامنے نہیں رہا تو اس سمندر سے نکلا ہوا ایک عظیم الشان دریا ان کے سامنے ہے جو اپنی بعض امتیازی خصوصیات کے ساتھ بدل الغلط نہیں بلکہ بدل صحیح ہے۔ (ایضاً ۱۶۹)

حضرت شیخ الہندؒ دیوبند سے سفر حجاز کے لیے روانہ ہوگئے اور مقصد آزادئ وطن تھا، اس کے اقدامات میں مشغول تھے کہ انگریزوں نے ان کو گرفتار کر کے جزیرہ مالٹا میں نظر بند کر دیا، پانچ سال قید وبند کی صعوبتوں کو برداشت کرنے کے بعد رہائی کے بعد ۲۰ رمضان المبارک ۱۳۳۸ھ-۱۹۲۰ء کو وطن واپس آئے، واپسی سے رحلت تک کل ۶ ماہ بقید حیات تھے، آخیر ۱۸ ماہ ربیع الاول ۱۳۳۹ھ-۱۹۲۱ء کی صبح کو آپ اس جہان فانی سے کوچ کر گئے، حضرت شیخ الہندؒ کے انتقال کے بعد دارالعلوم دیوبند کے ارباب حل وعقد نے مستقل طور پر آپ کو صدر المدرسین کے عہدہ جلیلہ پر فائز کر دیا، حضرت شاہ صاحبؒ ۱۳۴۶ھ تک اسی منصب پر فائز رہے۔ کہتے ہیں کہ زمانہ یکساں نہیں ہوتا، چنانچہ دارالعلوم دیوبند کے صیغۂ اہتمام اور صیغۂ تعلیم کے درمیان زبردست اختلاف ہوگیا، نقش دوام کے مصنف مولانا انظر شاہ لکھتے ہیں:

''دیوبند میں حضرت شاہ صاحب کا وفور علم پورے شباب پر تھا کہ بدقسمتی سے دارالعلوم
دیوبند میں ایک شورش برپا ہوئی جس کی تفصیلات دردانگیز ہے، اس فتنہ کا اثر حضرت مرحوم
کے قلب پر آخر تک رہا اور شاداب صحت کو ایک گھن لگ گیا''۔ (ص ۴۲)

مولانا عبدالرشید بستوی اس ضمن میں لکھتے ہیں:

۱۳۴۶ھ میں حضرت علامہ کشمیریؒ کا دارالعلوم کے نظام میں اصلاحات کے تعلق سے ارباب مدرسہ سے اختلاف ہوگیا، جب آپ کے وہ اصلاحی مطالبات انتظامیہ منظور نہ کیے تو آپ خاموش کے ساتھ استعفی دے کر دارالعلوم سے علاحدہ ہوگئے۔ (علامہ کشمیریؒ-اپنی ہشت ص۴۳،۴۴)

بیشتر سوانح نگاروں نے اس ضمن میں خاموشی اختیار کی ہے اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ حضرت شاہ صاحبؒ خاموشی سے صبر جمیل کرتے ہوئے مستعفی ہوگئے اور بعد اظہار نہیں کیا حالانکہ اس تعلق میں حضرت شاہ صاحب کی طرف سے مختصر اشارات ملتے ہیں جو بڑے حادثات وواقعات پر روشنی ڈالتے ہیں جیسا کہ نفحة العنبر کے مصنف مولانا یوسف بنوریؒ نے حضرت شاہ صاحب کے عربی کے چار اشعار کو پیش کیا ہے جس میں جان گسل اور تکلیف دہ داستان اشارہ کررہی ہے، ملاحظہ فرمائیں:

فقدت به قلبی وصبری وحیلتی ☆ ولم الق الإریب دهر تصرما

ومن عبرات العین مالا اسیغه ☆ ومن غلبات الوجد ما کان همهما

تکففت دمعی او کففت عنانه ☆ وضار یجای الدهر حتي تقدما

(ص۱۴)

اور اسی طرح مولانا احمد رضا بجنوری لکھتے ہیں کہ ایک بار شاہ صاحب نے ڈابھیل گجرات میں فرمایا:

''اس زمانہ میں کلمۂ حق کہنا بہت مشکل ہوگیا ہے ہم نے صرف ایک کلمۂ حق کہا تھا اور اس کی وجہ سے آج آٹھ سو میل دور پھینک دیا گیا'' (علامہ انور شاہ اور اُن کے تذکرہ نگار ص۴۲)

حضرت شاہ صاحبؒ تقریباً دو دہائیں تک دارالعلوم دیوبند میں مدرس اور صدر مدرس کی حیثیت سے ناقابل فراموش خدمات انجام دینے کے بعد صیغۂ اہتمام کے ارباب وحل کی اصلاح کی خاطر یان کے مجبور کرنے کے بعد آپ رنج وغم کے ساتھ مستعفی ہوگئے، آپ کے ساتھ کئی اساتذہ بھی مستعفی ہوگئے، یہ خبر پورے ہندوستان میں اخبارات کے ذریعہ پھیل گئی تو مشہور ومعروف اداروں نے معقول مشاہروں پر آپ کی خدمات حاصل کرنے کی کوشش کی، لیکن آپ نے اپنے مخلص شاگرد مولانا محمد میاں بن موسیٰ سملکی افریقی کی گزراشات کو قبول کرکے ڈابھیل گجرات جانے کو ترجیح دی، چنانچہ حضرت شاہ صاحب اور دیگر مستعفی شدہ اساتذہ کرام اور دوسو پچہتر طلباء کا قافلہ ڈابھیل پہنچا۔

نقش دوام کے مصنف مولانا انظر شاہ مسعودی لکھتے ہیں:

''ڈابھیل کی غیر مشہور درسگاہ مرحوم کی تشریف آوری کے بعد جامعہ اسلامیہ کے نام سے مشہور ہوئی، علامہ کے دور میں طلباء کی تعداد ایک ہزار کے لگ بھگ تھی تمام ہندوستان سے کھنچ کر طلباء حدیث ڈابھیل پہنچنے لگے اور آپ کی شہرت علمی کی وجہ سے اس درسگاہ کو وہ

مرکزیت حاصل ہوئی کہ ''جامعہ'' منتخب مدارس میں شمار ہونے لگا'' (ص۴۴، ۴۵)

حضرت شاہ صاحب نے دیوبند اور ڈابھیل میں جو تدریسی خدمات انجام دی ہیں اور ان کے انمٹ نقوش جو ثبت ہوئے ہیں وہ صاحب سوانح کا زرّیں دور ہے، کیونکہ اسی اثنا میں شاہ صاحب نے خداداد قوت فہم اور قوت حافظہ سے امت مسلمہ کے لیے جو جماعت شاگرد کے شکل پر تیار کردی ہے، اس کی کرنیں تا قیامت روشنی کے ساتھ بکھرتی رہیں گی، صاحب سوانح کے تدریسی دور کا بھی سوانح نگار نے بھرپور احاطہ کرنے کی کوشش کی ہے اور یہ بتایا کہ شاہ صاحب نے احسانی کیفیت کے ساتھ اپنی تدریس کو انفرادی اور دلپذیر بنایا تھا۔ جیسا کہ مولانا انظر شاہ، مولانا احسن گیلانی ور مولانا قاری محمد طیب قاسمی سے استفادہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''مناظر احسن گیلانی نے اپنے ایک طویل مقالہ میں ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ آپ کے درس میں نہ صرف نادر علوم سے واقفیت ہوئی بلکہ کانوں میں ان نایاب کتابوں کا نام بھی پڑتا جن کی دید وشنید سے عام علماء ناواقف ہیں (ص۱۲۱، ۱۲۲)

درس کی خصوصیت کو مولانا قاری طیب صاحب کچھ اس طرح لکھتے ہیں:

> ''حضرت شاہ صاحب کا درس حدیث محض حدیث تک محدود نہ تھا بلکہ فقہ، تاریخ، ادب، کلام، فلسفہ، منطق، ہیئت، ریاضی، سائنس۔ الغرض تمام علوم جدیدہ وقدیمہ پر مشتمل ہوتا، نیز یہ بھی فرمایا کہ درس کا آپ کا یہ اجتہادی طرز دور حاضر کے فتنوں کے مقابلہ کی سوچی سمجھی تیاری تھی، چنانچہ آپ خود درس میں طلباء کو مخاطب کر کے فرماتے: ''بھائی اس زمانہ کے علمی فتنوں کے مقابلہ میں جس قدر ہوسکا ہم نے سامان جمع کر دیا ہے''۔ (ص۱۵۴)

مذکورہ بالا حوالوں سے پتہ چلتا ہے کہ شاہ صاحب نے اپنے شاگردوں کو صرف کتاب ہی نہیں پڑھائی بلکہ ان کے ذن ودماغ کو قال اللہ اور قال الرسول کی صداؤں کو بلند کرنے کے لیے تیار کر دیا، چنانچہ ان کے شاگردان نے ممکنہ حد تک حضرت شاہ صاحب کی خوبیوں کو تحریر وتقریر سے وسعت دینی کی کوشش کی، ان کے بیشتر سوانح نگار شاگرد ہیں یا ان کی علمی وقعت سے متاثر ہیں اس وجہ سے سوانح نگاروں نے شاہ صاحب کی تدریسی دور کو ایک ایک عنوان بنا کر دلائل وواقعات سے قارئین کے نظر کیا ہے جس میں بے مثل حافظہ، وسعت مطالعہ، کثرت مطالعہ، تبحر علمی، حفظ حدیث، نقد وخلافیات کا حفظ، طبقاتِ فقہاء پر ایک نظر، مشاہیر فن کے متعلق رائیں، مصطلحات فن پر اضافہ حسن سیرت، زہد وقناعت، خودداری، تواضع، صاحب بیان، اساتذہ کا احترام، کتاب کا احترام، احترامِ شخصیت، طلباء پر شفقت، حنفیت کی ترجیح واستحکام، فتنۂ قادیانیت اور اس کا استقبال وغیرہ ہیں، ان عنوانات کے تحت سوانح نگاروں نے مشاہدات اور شاہ صاحب کے اساتذہ ومعاصرین سے استفادہ کرتے ہوئے اہم باتیں لکھیں ہیں جس میں علم وعمل کا مثالی پیغام مضمر ہے۔